راجر گیراڈی/ (ترجمہ) آدم پال

راہروِ گم گشتہ: ژاں پال سارتر

سارتر دستویفسکی کے ناول "The Possessed" کے کردار کیریلوف کا فقرہ دہراتا ہے ''اگر خدا کا وجود نہ ہوتا، تو ہر چیز کی اجازت ہوتی۔ اور سارتر اس میں یہ اضافہ کرتا ہے'' یہاں سے وجودیت کی راہیں جدا ہو جاتی ہیں۔'' لہٰذا سارتر کا آزادی پر غور و خوض ملامتی مفروضے سے شروع ہوتا ہے۔ یا تو خدا میرے اردگرد موجود ہے اور مجھے احکامات دیتا ہے، یا میں خلا void میں ہوں۔

اس نے مسئلے کو بالکل اسی انداز میں پیش کرتا ہے جیسا کہ میں نے کیا، اور جیسا کہ یہ ان تمام لوگوں کے لئے ہے جن کے لئے خدا موجود نہیں۔

وہ دعویٰ کرتا ہے: ''ہمارا راستہ فرد کی موضوعی تاریخ سے جدا ہوتا ہے اور ڈیکارٹ کا نام لیتا ہے۔ اور خالی ذہن (شفاف سلیٹ) tabula rasa جیسا فلسفہ استوار کرتا ہے۔

مارکس نے کہا ''انسان اپنی تاریخ خود بناتے ہیں۔ لیکن وہ اسے جیسا چاہیں ویسا نہیں بنا پاتے۔ وہ اسے ان حالات میں نہیں بناتے جن کا انتخاب انہوں نے خود کیا ہے۔ وہ اسے بلا واسطہ موجود حالت میں بناتے ہیں جن کی ترسیل ماضی نے ان تک کی ہے۔

یہ وہ نقطہ ہے جہاں سے ہمارا وجودیت سے اختلاف شروع ہوتا ہے۔

سوچ، جب عمل سے دور ہو جائے تو یہ بیماری بن جاتی ہے۔ اس بیماری کو کبھی دیومالا، کبھی تصوف، کبھی عینیت کہا جاتا ہے۔ آج کے دور میں اسے وجودیت کہا جاتا ہے۔

یقیناً یہ بیماری ہے۔ روقوینٹن اپنے کرب nausea کو اسی نام کے ناول میں یوں بیان کرتا ہے، ''اشیا تمہارے ہاتھ میں وجود رکھنے لگ پڑتی ہیں۔'' ہمیں تھوڑی دیر کے لئے شبہ پڑ جاتا ہے آیا کہ مستری نے اچانک اپنے ہاتھوں میں اوزاروں کو دریافت کر لیا ہے۔ روقوینٹن کا نظریہ اس بیمار شخص جیسا ہے جسے ڈاکٹر پائرے جینٹ نے یوں بیان کیا ہے۔ وہ دکھاتا ہے کہ انہوں نے 'حقیقی کا عمل' کیسے گنوا دیا ہے، وہ اس طرح اپنے آپ کا اپنی ہی maladjustment پر انحصار کر کے ایک مابعد الطبعیات بناتے ہیں۔ ان کا بنیادی مسئلہ ان الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے: 'کچھ نہ' کی بجائے 'کچھ' کیوں وجود رکھتا ہے؟ کیا میں واقعی وجود رکھتا ہوں؟ کیا میرے اردگرد اشیا وجود رکھتی ہیں؟ یہ وجودیت کے بنیادی سوالات ہیں اور سارتر کا Being and Nothingness پر تھی سس مابعد الطبعیاتی پتھالوجی پر منحصر ہے۔ صحت مند انسان کا فلسفہ اس نکتے سے آگے شروع ہوتا ہے۔

بورژوازی کی دنیا جو افراتفری کا شکار ہے، کسی بھی قیمت پر عقل و خرد کو برتری حاصل نہیں کرنے

دیتی۔تاکہ افراتفری اور درہم برہم صورت حال موجود رہے، بورژوا دانش یہ تقاضا کرتی ہے کہ سوچ بچار کو تجرید کی دنیا میں جلاوطن کر دیا جائے۔ جب ہر فلسفی، گلہری کی طرح جو پنے پنجرے میں ہی گھومتی رہتی ہے، اپنے چمک دار بلبلے میں گھومنا شروع کر دیتا ہے تو سماجی سسٹم کوئی خطرہ مول نہیں لیتا۔ ہر ایک مطمئن ہوتا ہے اور فلسفی اپنی 'آزادی' میں خوشی کے نغمے گاتا ہے۔

مزاحمتی تحریک نے بہت سے سوئے جاگتے فلسفیوں کو جگا دیا۔ سارتر ان میں سے ایک تھا۔ آخر کار اسے یہ احساس ہوا کہ وہ اس قابل ہونے جا رہا تھا کہ اپنی 'آزادی' کا کچھ کرے۔ اپنے رسالے Les letters Francaises کی ستمبر 1944 کی اشاعت میں اس نے بڑے دکھ کے ساتھ ماضی کو یاد کیا: ''ہم اس سے زیادہ کبھی بھی آزاد نہ تھے جتنا ہم جرمن قبضے کے دوران تھے۔ پھر وہ کہتا ہے یہ ''سوال نہ کہنے کا تھا''۔ یہ پر معنی بات ہے۔ آزاد ہونے کا مطلب ہے 'نہ' کہنا۔ یہ ان لوگوں کا نقطہ نظر ہے جن کا تعلق [صرف] ماضی سے ہے؛ آزادی نفی کا دوسرا نام ہے۔ وہ لوگ جو مستقبل پر نگاہ رکھتے ہیں اور اسے بدلنا چاہتے ہیں، ان کے لئے آزادی کا مفہوم منسلک رہنا اور تعمیر ہے۔ سارتر اور اس کے ہمنواؤں کو مزاحمتی تحریک میں بہت بڑی isolation ملی۔ ''یہ مکمل ذمہ داری، مکمل تنہائی میں، کیا یہ ہماری آزادی کا کھلنا unfolding نہیں؟

اور جب کوئی ایسی چیز نہ بچی جس کی نفی کی جا سکے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ جب سب سے اہم بات ہی یہ تھی کہ انکار نہ کیا جائے، تو ایسی آزادی کا کیا فائدہ؟ وہ آزادی جو سوائے علیحدی اور انکار کے کچھ نہ تھی بگڑ کر بے ہنگم بے وضع آزادی کی شکل اختیار کر گئی۔ سارتر اور اس جیسوں نے کبھی بھی اپنے آپ کو عوام کا حصہ نہ سمجھا، کبھی بھی اپنے آپ کو تاریخ اور انسانوں سے ایک نہ کیا۔ اس لئے ان کے نزدیک آزادی سے مراد لازمیت کی جدلیات میں تخلیقی حصہ ڈالنا نہیں۔

وجودیت کی تعریف (for man, existence precedes essence) پر رائے زنی کرتے ہوئے سارتر لکھتا ہے: انسان دنیا میں نمودار ہوتا ہے اور بعد ازاں اپنی تعریف defines کرتا ہے۔ ہم اس کی بات تسلیم کرتے ہیں کہ خالصتاً منطقی اعتبار سے انسان کی کوئی ''تعریف'' نہیں۔ مطلب یہ کہ انسان کے پاس ازلی توصیفات اور خصائص کا مجموعہ نہیں۔ لیکن اس کا ماضی ضرور ہے۔ یہ ماضی واضح طور پر متعین ہے۔ شاعر پونگے کے الفاظ میں انسان نہ صرف انسان کا مستقبل ہے، وہ اس کا ماضی بھی ہے۔

اس نقطے کو نظر انداز کرنا، ہمیں جمود، اور خصی پن کی طرف لے جاتا ہے کیونکہ ہم نے اپنی آزادی کی دو زندہ جڑوں کو کاٹ کے رکھ دیا ہے، یعنی تاریخ اور علم۔ تاریخ سے اکھڑ کر آزادی سوائے بے اثر دکھاوے کے کچھ نہیں۔

ہم ننگ دھڑنگ وحشی نہیں جن کا کوئی ماضی نہیں اور جو ایک ایسے جنگل میں آن پہنچے ہیں جہاں پہلے کوئی انسان نہیں آیا تاکہ 'انتخاب' کر سکیں۔ تاریخ وجود رکھتی ہے اور اس کے بتائے ہوئے رستے کے ایک مقام پر ہیں۔ یہ وہ سپرنگ بورڈ ہے جو ہمیں آگے جانے میں مدد دیتا ہے اور اس طرح اعلیٰ درجے پر آزادی کا حصول ممکن ہو جاتا ہے۔

ہم آزادی کی راہ پر سفر کرنے والے نہ تو اکیلے لوگ ہیں نہ اولین لوگ۔ کچھ لوگ پہلے ہی زمین ہموار کر چکے ہیں اور کچھ اس عمل میں مشغول ہیں۔ ہم تاریخ کے وارث ہیں۔ تاریخ کا مطلب ہے دوسرے لوگ، وہ لوگ جو زندہ ہیں اور وہ بھی جو پچھلے ادوار میں تھے۔ انہوں نے وہ اوزار اور تکنیکیں ہمارے حوالے کی ہیں جو ابھی مکمل نہیں لیکن ان کا وجود ضرور ہے۔ اسے سماجی نظام کہتے ہیں، اور یہ انسان کی محنت اور کوشش میں ہم آہنگی لاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی لمحے یہ اتنے عمدہ انداز سے نہ ہو رہا ہو۔

مختصراً، آزادی ایسا تحفہ نہیں جو آسمان سے میری جھولی میں آن ٹپکتا ہے یا اچانک زمین سے باہر نکل آتا ہے، بلکہ یہ ایسا کام ہے جو دوسروں نے شروع کیا ہے اور اس پر میں زیادہ ذہانت اور زیادہ پر اثر انداز میں کام کروں گا۔ تاریخ کو مٹا کر وجودیت ہمیں قدیم انسان کے پتھر کے کلہاڑے کی طرف لے جانا چاہتی ہے یا اس تنہا کاریگر کی طرف جو آزادی کے راستے کو صاف کر رہا ہے۔ ہزاروں سالوں کی انسانی تاریخ نے ہمیں زیادہ پر اثر اور فعال طریقے بتائے ہیں۔

لیکن کچھ لوگ کہیں گے کہ میں آزاد ہوں کہ تمہاری اجتمائی ورک شاپ میں شامل ہوں یا نہ ہوں۔ اور اسی میں میری مکمل ذمہ داری ہے۔ سارتر لکھتا ہے کہ کوئی بھی مزدور'' آزاد ہے کہ چونکہ وہ ہمیشہ یہ انتخاب کرسکتا ہے کہ اپنی تقدیر کو قبول کرے یا اس کے خلاف بغاوت کردے۔''

لیکن اگر یہ انتخاب، جیسا کہ سارتر ہمیں یقین دلاتا ہے، اتنا ہی مکمل طور پر آزاد ہے اور وقت کی قیود سے باہر ہے تو ایسا کیوں ہے کہ جب سرمایہ دار معاشرے کے تضادات شدید ہو جاتے ہیں تو مزدوروں کی اکثریت انقلابی نقطہ نظر اپنا لیتی ہے؟ اور کسی بڑے سرمایہ دار کا انقلابی جدوجہد میں شریک ہونا مستثنیات میں شامل ہوگا؟

اس کی وضاحت صرف اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ فرد کا کردار پیداواری عمل میں کیا ہے، یعنی اس کا تعلق کس طبقے سے ہے۔ اسی میں ہی اس کے انتخاب کی نوعیت کا تعین ہوتا ہے۔ لہٰذا اس قسم کا فیصلہ مطلق اور وقت کے علاوہ نہیں، یہ مختلف نوع کی لازمیت سے برآمد ہوتا ہے۔ میرے اور میری آزادی کے درمیان میرا علم ہے۔

اس مرحلے پر آزادی کی دوسری شرط سامنے آتی ہے، یعنی سائنس۔ سائنس آزادی کو اس طرح جنم دیتی ہے جس طرح تنے پر پھول۔ دنیا کی افراتفری اور بے ہنگم پن میں آزادی کا ظاہر ہونا جس کے کوئی قوانین ہی نہ ہو بے عملی اور خصی پن کی طرف لے جاتا ہے، جس کا دوسرا نام ہے غلامی اور مایوسی۔

بے ہنگم آزادی تاریخ کے ایسے نظریے کو جنم دیتی ہے جس کی نہ تو کوئی ساخت ہے، نہ ہی اس کی پیش بینی کی جاسکتی ہے۔ کوئی بھی کسی فرد کے بارے رائے قائم نہیں کرسکتا جب تک اس کے عمل کا سلسلہ ختم نہ ہو۔ دوسرے الفاظ میں، اس کی موت سے پہلے۔ یہ سارتر کے ڈرامے No Exit کا مرکزی خیال ہے۔ چونکہ ابھی ہم نے انسانی نسل کو مرتے نہیں دیکھا، ہم اس کی تاریخ کو نہیں جان سکتے!!

"The sense of the social past is perpetually in reprieve."B&N

یہ سنجیدہ معاملہ ہے، اس لئے کہ اگر ہمارا ماضی بغیر کسی شکل اور وضع کے ہے، اگر ہر چیز ہر لمحے اپنا مفہوم بدلتی رہتی ہے، تو ہمارے پاس مستقبل کا مقابلہ کرنے کا کوئی ہتھیار نہ بچے گا۔ اگر تاریخ کا سائنسی علم نہیں تو سیاست میں بھی کوئی پر اثر تکنیک نہیں۔

اس طرح ہم وجودیت کی سب سے بڑی ناکامی کو دیکھتے ہیں: سائنس سے لاتعلقی۔ سارتر کے خیال میں یہ موروثی ناکامی ہے جو کہ کیرکے گارد اور نطشے کا ورثہ ہے اور وجودیت کے مقتدین کے لئے بہت بھاری پڑتا ہے۔ بادل نخواستہ، موضوعیت کے جواز ڈھونڈتے ہوئے وہ سائنس سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔ سارتر کے فلسفہ میں آزادی مطلق انتخاب ہے اور اس کا تعقل سے کوئی لینا دینا نہیں۔ تاریخ جو موضوعیت میں ڈوبی ہوئی ہے اور مسلسل کسی جواز کے انتظار میں ہے جو کبھی بھی نہ حاصل ہوگا، اس کا سائنس سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ وجودیت کی پراسراریت پسندی کا پول کھولنے کے لئے کافی ہے جو کہ اس کا بنیادی خاصہ ہے۔ اور یہ پراسراریت، باوجود سارتر کی دہریت کے، نوجوانوں کو اور زیادہ مذہب کی طرف لے کر جائے گی بجائے اس کے کہ انہیں معاشرتی تبدیلی کے لئے جدوجہد کی طرف لے کر جاتی۔

اس پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ ''آپ کی جدلی مادیت انسان کو شے تک محدود کر دیتی ہے۔ یہ اس کی آزادی اور انفرادی آزادی کو تہس نہس کر دیتی ہے۔'' پچھلے ڈیڑھ صدی سے کیتھولک چرچ نے اس دلیل کی بار ہا دہائی دی ہے۔ کیا جدلی مادیت کے فلسفے پر یہ اعتراض کرنا تضاد سے پر اور تاریخی تجربے کو جھٹلانا نہ ہوگا؟ کیا پچھلی دو صدیوں سے انقلابی، Encyclopedists سے گراشس بابیوف، اور بلانکی سے لے کر مارکسسٹوں تک آزادی کے لئے عظیم قربانیاں نہیں دیں؟

مادیت اور آزادی، تعیین اور آزادی کی مخالفت کرنا مادیت اور تعیین کو مسخ کرنا ہے۔ اپنے رسالے Les Temps modernes میں سارتر مادے کی یہ تعریف کرتا ہے: مادے کا خاصہ اس کا inertia ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اپنے آپ سے کچھ پیدا نہیں کر سکتا۔ حرکت اور طاقت کا ذریعہ، یہ حرکات اور یہ طاقت ہمیشہ خارج ہی سے آتی ہیں۔ یہ انہیں مستعار لیتا ہے اور ان کے مطابق چلتا ہے۔''

کچھ عرصہ پہلے لکھے گئے ایک مضمون میں پال لینگیون نے رائے زنی کی کہ اس طرح کی تعریف موجودہ سائنسی ترقی کو دو ہزار سال پیچھے لے جاتی ہے۔ Lucretius نے Epicurus کی پیروی کرتے ہوئے اس تخیل کو یہ ٹھوس شکل دی: لامحدود چھوٹی چھوٹی کنکریاں جو خلا Void میں گر رہی ہیں، اور رگڑ کے قانون کے مطابق ایک دوسرے سے پرے جا رہی ہیں۔ اس میکانکی عمل میں آزادی کا دخول کرنے کے لئے لوکریشس کو کوئی معجزہ درکار تھا، یعنی اس میکانکی عمل سے ہٹنا جو اس کے نزدیک تعقل کی تعریف کرتا تھا۔ اس نے اس غیر تعقلی عنصر کو، اس شے کے رجحان کو معجزہ قرار دیا۔ سارتر بھی یہی غیر تعقلی، اور معجزہ حاصل کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ چھوٹا سا ہٹاؤ حاصل کیا جا سکے جو انسان کے لئے ناگزیر ہے تاکہ وہ زندگی کی تعیین سے چھٹکارا حاصل کر سکے۔

لیکن سارتر کے پاس اب وہ بہانہ نہیں جولوکریشس کے پاس تھا۔ دو ہزار سال کی سائنسی ترقی نے ہمیں تعیین اور مادے کی اس سے سادہ تصویر مہیا کی ہے۔ ذرائع بقا کی پیداوار اور زندہ رہنے کے لئے، انسان کو ایسی سائنس کی ضرورت ہے جو اسے فطرت پر برتری دے۔ اس کے لئے لازم ہے کہ قوانین فطرت کو جانے۔ اس کو یہ علم بھی حاصل کرنا ہے کہ اس سلسلے کے کس نکتے پر اس نے اپنے عمل کو لاگو کرنا ہے تا کہ فطرت کو اپنی ضروریات کے مطابق شکل دے سکے۔

فطرت کے مظاہر کے مابین تعلق کا علم تعیین determinism کہلاتا ہے۔ علت وہ کڑی ہے جس پر میں عمل کر سکتا ہوں۔ اس کا انحصار اور اس کا کم یا زیادہ ہونا دنیا کے تصور- خیال- سمجھ پر ہے جو کسی خاص وقت میرے پاس ہے۔ اس میں دوسرا عنصر اس عمل کے ذرائع کا ہے۔ اس سے مراد سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کا درجہ ہے۔ لہٰذا عناصر فطرت کے مابین تعلق کا علم جامد طور پر بیان نہیں ہوسکتا۔ سائنسی ترقی اور دریافتیں ہر لحظہ ان میں بہتری لاتی رہتی ہیں۔

ڈیکارٹ کے دور میں، اس کی تجزیاتی جیومیٹری میں دریافتوں کے بعد، الجبریائی فنکشن اس کے علم کا ماڈل تھا۔ اسی دور میں Vaucanson's automata ٹکنالوجی میں حرف آخر تھا۔ ان کے زیر اثر بہت سے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ فطرت میں تمام اشیا اس طرح جڑے ہوئی ہیں جس طرح مشین کے کل پرزے آپس میں جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ تعریف نہ تو مکمل تھی نہ ہی تعیین کے پورے معنی بتاتی تھی۔ میکانکی تعیین فطرت کے نظریہ اور اس کے قوانین جاننے کا ابتدائی درجہ، مرحلہ تھا۔ سائنسی طریق کار جس کا واسطہ اب انتہائی پیچیدہ اشیا سے تھا، نے تعیین کے نظریے کو زیادہ وسیع اور لچک دار بنا دیا ہے۔ جیسا کہ لینگیون نے کہا کہ اب تعیین کے انکار یا اس سے پیچھے ہٹنے کا معاملہ ہی نہیں رہا، کیونکہ اب ہم [فطرت میں] زیادہ تعلقات جانتے ہیں اور ان پر زیادہ یقین اور طاقت کے ساتھ عمل کرتے ہیں۔

حیاتیات، پھر سماجیات اور تاریخ نے ہمیں تعیین کا بہتر اور اعلیٰ نظریہ تشکیل دینے میں مدد دی ہے جس میں زندگی کی مسلسل تخلیق اور سماجی واقعات وعوامل کا تعین، جیسا کہ خودکشی، بیروزگاری، جرائم وغیرہ کو شماریاتی ڈاٹا کے ذریعے جاننا ہے۔ تمام دوسرے علوم نے ان نئی تحقیقوں سے فائدہ حاصل کیا ہے۔ طبعیات بھی شماریاتی ڈاٹا کو استعمال کر رہی ہے، اور مادے کا موجودہ نظریہ اسے تخلیق اور تباہی کا مرکز بنا دیتا ہے۔

چونکہ جدید دور میں ہمارے پاس مادے اور اس کے تعیین کا پچھلے زمانوں کی نسبت بہتر نظریہ ہے، یقینی بات ہے کہ کہ ہماری سائنس کی ترقی میں، جیسا کہ ہماری تاریخ کے ارتقا میں، ایسے ادوار آئے ہیں جو اگرچہ مکمل افراتفری کے نہ تھے لیکن ان میں بے یقینی بہت زیادہ تھی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ادوار یا لمحات ایسے تھے جن میں کم اغلب انتخاب ہی ممکن تھا۔ وہ میری اخلاقی زندگی کے مواد نہیں۔ ان کی اخلاقی زندگی میں اعلیٰ درجے کی اہمیت نہیں۔ انہیں ہم بحران یا کم ترقی کے ادوار کہہ سکتے ہیں۔ وہ عارضی خلا کو ظاہر کرتے ہیں، یہ خلا یا تو میری سمجھ بوجھ میں ہیں یا پھر سائنس میں۔

جتنا زیادہ میرا علم ہوگا اتنا ہی میں آزاد ہوں گا۔ میں اس وقت آزاد ہوں گا جب میں زیادہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کوئی اور انتخاب نہیں۔ سپائی نوزا اور اس کے بعد ہیگل نے ہمیں بتایا کہ آزاد ہونے کا یہ مطلب ہے ہ میرے پاس تمام تعقل ہو جو میرے عمل کی بنیاد ہے۔

یقیناً تعقل جو کچھ ہمارے لئے ہے، ان کے لئے نہ تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک ازلی حقیقت جو سائنس اور ٹکنالوجی سے آزاد ہے جو اسے ہر روز نئی شکل دیتی ہیں۔ وہ لازمیت جو ہمارے عمل کا تعین کرتی ہے اکثر اوقات صرف قریب قریب ہی ہوتی ہے، جیسا کہ ہمارا علم۔ لیکن جو سچائی رہ جاتی ہے وہ یہ ہے کہ جتنا زیادہ یہ قرب ہوگا، اتنا زیادہ compulsive زور آور ہمارا علم ہوگا۔ اور اس دن جب آخر کار ہمارے سماجی تعلقات میں اور فطرت کے ساتھ ہمارے تعلق میں کوئی ان دیکھی چیز نہ رہ جائے گی، اس دن سقراط کا خواب سچا ہو جائے گا۔

یہ لازمیت، جو اور بھی زیادہ ضروری ہے کیونکہ یہ اور بھی زیادہ تعقل پر مبنی ہے آزادی کی اعلیٰ ترین شکل ہے۔ اسے انگلستان کے لوگ لازمیت کی دنیا سے آزادی کی دنیا میں قدم رکھنا کہتے ہیں۔

ہم مارکسیوں کے خیال میں آزادی کا مطلب ہے فطرت، سماجی تعلقات اور اپنے آپ پر زیادہ دسترس۔ اس حوالے سے یہ علم اور معاشرے کی ترقی کا پیمانہ ہے۔ اس کا مطلب ہے مستقبل کے لئے تعمیر۔ یہ بنیادی طور پر تصدیق اور تعمیر ہے۔ اور یہ مستقبل کی تعمیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی کا یہ نظریہ تعمیر کرنے والوں کا خاصہ ہے نہ قبریں کھودنے والوں کا (جیسا کہ تاریخ نے اس کی تصدیق کی ہے)۔ یہ ان لوگوں کا فلسفہ ہے جو مستقبل سے محبت کرتے ہیں۔ جو اس کی آواز سنتے ہیں اور اس کی تیاری کرتے ہیں، پہلے سے یہ جانتے ہوئے کہ مستقبل ان کا ہے۔ یہ Helvetius and Diderot جیسے لوگوں کے لئے سچ تھا۔ یہ وہ مادی فلسفی تھے جو عظیم انقلاب فرانس کے وقت بورژوازی کے ترجمان تھے۔ آج یہ بات مزدور طبقے کے لئے سچ ہے جو اس بات کی قائل ہے کہ مستقبل ان کا ہے۔ 1848 سے لے کر مارکس اور اینگلز کے ساتھ؛ 1917 سے لے کر لینن اور سٹالن کے ساتھ [لوگ اس مستقبل کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں]۔

سائنس کو نظر انداز کر کے، سارتر عمل کی طرف نہیں رخ نہیں موڑ سکتا۔ نہ تو وہ کوئی ایسا طریقہ وضع کر سکتا ہے جو حقیقت کو تبدیل کر سکے، نہ ہی وہ کوئی ایسا نظریہ قبول کر سکتا ہے۔ سچائی یہ ہے کہ ہر اس چیز کو چھوڑ کر جو آزادی کو پر تعقل بنا سکتی ہے اور تاریخ کو سائنسی، سارتر اپنے چیلوں کو ایسی موضوعیت میں جس کے کوئی قوانین نہیں، اور ایسی دنیا میں جس کی کوئی ساخت نہیں چھوڑ دیتا ہے۔ تو ایسی موضوعیت جو بے وضع دنیا میں ہے اس کا کیا ہوتا ہے؟ یہ آہستہ آہستہ غائب ہو جاتی ہے۔ سارتر مادیت سے انکاری ہے اور اس کے باوجود دعویٰ کرتا ہے کہ وہ عینیت پسند نہیں۔ یہاں ہمیں اس ناممکن ''تیسرے راستے'' کا بے معنی پن نظر آتا ہے۔ Phenomenalism مظہریات غیر مستحکم موقف ہے لیکن سارتر کے ہاں یہ عدم پختہ نہیں، یہ پوری طرح سے عینیت کی سطح تک گر جاتی ہے۔ یہ عینیت بھی انتہائی گھٹیا قسم کی ہوتی ہے جس

میں وہ ٹھوس اور تعقلی روایت محفوظ نہیں رہتی جسے ہیگل استوار کرنے میں کامیاب ہوا۔

یہ مختصر سا بیان، جس میں وجودیت کے چیدہ چیدہ اصول ہی بیان کئے جا سکے ہمیں مارکسی نقطہ نظر سے وجودیت کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ سارتر نے کچھ عرصہ پہلے Action میں لکھا کہ وہ ''مارکس کے انسان کے بارے نظریات سے دور'' نہ تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ''مارکس کو موضوعیت کے رخ سے مکمل کیا جائے''۔

لیکن وجودیت مارکسزم کا تکملہ نہیں، یہ اس کی نفی ہے۔ اس کے آزاد ارادے کے نظریے سے لے کر اس کے نظریہ علم تک، اس کی سائنسی تاریخی سے انکار سے لے کر اس کے سائنس سے انکار تک، وجودیت انسان کو بے عمل بنا دیتی ہے۔ یہ اسے آزادی کے ہتھیار سے محروم کر دیتی ہے جو کہ دنیا کی اور انسان کی سائنس ہے۔ اور انقلاب ایک خالی خولی لفظ ہے اگر یہ ایک سائنس نہیں۔ آزاد یا انقلابی فرد وہ نہیں جو اپنے آپ میں کسی ذاتی مہم جوئی کا امکان تلاش کرتا ہے، یا انکار کی طاقت، یا بقول سارتر nothingness تک محدود کرنا ہی آزادی ہے؛ بلکہ وہ شخص آزاد ہے جس نے سائنس کو بقول لینن اپنے اندر سمو لیا ہے اور اپنی آزدی کو سماجی ساخت کے حوالے سے جانچتا ہے۔

تنہا اور بے ہنگم آزادی کے ہیولے ان آدمیوں کے لئے کشش رکھتے ہیں جن کی کوئی جڑیں نہیں اور جو مایوسی سے بے عمل ہو چکے ہیں، ان کے ذریعے سارتر ہمارے طالب علموں کو اندھی گلی میں دھکیل دیتا ہے۔ اس کا ڈرامہ The Flies بڑی افسردگی سے ان بے جان دانشوروں کے کرب کو بیان کرتا ہے جو اپنی ثقافت سے علاوہ کسی حقیقی چیز کی تلاش میں ہیں۔ اس کا ایک کردار آریسٹیز پکارتا ہے ''میں خلا میں رہ رہا ہوں۔ میں بالکل تنہا ہوں۔ سارتر اس تجریدی خواہش سے آگے مقرونی تک نہیں جا سکتا۔

اس بے وضع دنیا نے اپنا مقصد گنوا دیا ہے۔ اس کی آزادی کا کوئی مافیہا نہیں۔ اور وہ لوگ جنہیں اس نے اپنے پرانے کپڑے پھاڑتے اور سڑی ہوئی خوراک قے کرتے پایا ہے، انہیں وہ ننگا اور بھوکا چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے فلسفے میں کچھ بھی ایسا نہیں جو عمل کی طرف لے کر جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا فلسفہ بہت زیادہ رجعت پسندانہ ہے۔ وہ لوگ جو ایک ہوائی دنیا میں پہنچ چکے ہیں، یہ انہیں اس میں ہمیشہ کے لئے بند کر دیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ وجودیت بہت کم پیمانے پر تباہی پھیلا سکا۔ یہ ایسی وبا ہے جو پوری قوم کو اپنی لپیٹ میں نہ لے سکی۔ زندگی سے کٹے ہوئے اس فلسفے کا مزدور طبقے پر کوئی اثر نہیں جو فلسفے کے سنہری اصول کا پاسدار ہے کہ سوچ عمل سے پیدا ہوتی ہے اور یہ عمل کے ماتحت ہے۔ یہ ہلکا سا بخار یا مروڑ ان دانشوروں کو اٹھتا ہے جو اپنے آپ کو مزاحمتی تحریک کے بعد 'عمل سے عاری' گردانتے ہیں۔ وسیع تر عوامی طبقات سے جدا ہو کر وہ اپنے کنفیوژن اور اپنی nothingness کو اپنے لئے دیوتا کا درجہ دے دیتے ہیں۔ ان کا یہ وہم ہوتا ہے کہ وہ اتنے بڑے دانش ور ہیں اس لئے ان کے شایان شان مقصد موجود نہیں۔